ابوعمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

مغرب کے مسلمانوں کا دینی تشخص

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میں برطانیہ کے سفر کے دوران ایک روز لندن سے بذریعہ ٹرین مانچسٹر جا رہا تھا۔ ایک نوجوان میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ کیا آپ مولانا صاحب ہیں؟ میں نے کہا کہ لوگ یہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا آپ اجتہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اگر آپ کے پاس اجتہاد کی اتھارٹی ہے تو میں اپنی ایک مشکل آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اتھارٹی کی بات چھوڑو، مسئلہ بتاؤ۔ اگر میری سمجھ میں آ گیا تو کوئی نہ کوئی حل بتا دوں گا۔ کہنے لگا کہ میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور نماز پابندی سے پڑھتا ہوں، لیکن یہاں مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ ملازمت کے اوقات کار کی وجہ سے ظہر اور عصر کی نماز کے لیے وقت نہیں ملتا، جس کا حل میں نے یہ نکالا ہے کہ ظہر کی نماز صبح فجر کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں اور عصر کی نماز شام کو مغرب کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔ اس نوجوان کے ذہن میں اجتہاد کا مطلب ''صواب دیدی اختیار'' تھا کہ جس طرح مسیحیت میں پاپائے روم کو دینی احکام کی تعبیر وتشریح میں صواب دیدی اختیارات حاصل ہیں، شاید مسلمان علما کے پاس بھی اس طرز کا کوئی صواب دیدی اختیار رہتا ہوگا، اس لیے اگر کوئی اس اتھارٹی کے حامل مولانا صاحب مجھے اجازت دے دیں تو میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

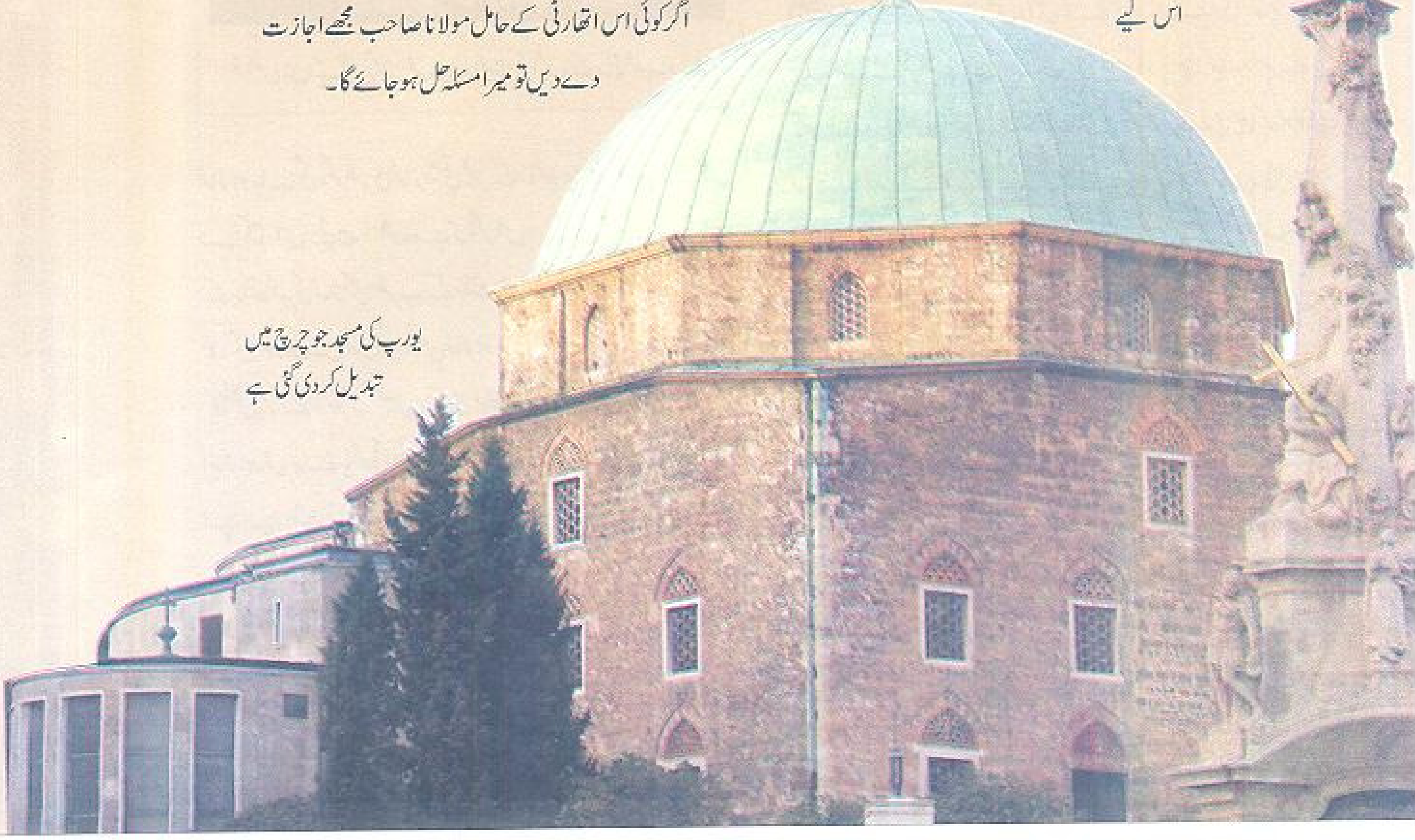

یورپ کی مسجد جو چرچ میں
تبدیل کر دی گئی ہے

میں اسے اس مختصر ملاقات میں یہ تو نہیں سمجھا سکا تھا کہ اجتہاد کسی صواب دیدی اختیار کا نہیں، بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں کسی مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے علمی کاوش کا نام ہے اور اس کے کچھ اصول وقواعد ہیں جن کے دائرے میں رہ کر ہی اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی بحث اس کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی اور میں اسے مزید پریشان کر دوں گا۔ اس لیے میں نے اسی کی ذہنی سطح پر اس سے بات کرنا زیادہ مناسب سمجھا اور یہ کہا کہ برخوردار! میں اس مسئلے میں فقتی فقتی اجتہاد کر سکتا ہوں۔ اس طرح کہ عصر کی جو نماز آپ مغرب کے ساتھ پڑھتے ہیں، مجبوری کے درجے میں اس کی اجازت دے سکتا ہوں کہ قضا ہوگی، لیکن

فرانس میں ایک قبر پر کتبہ: محمد بن عبدالسلام فرانس کے لیے شہید ہوئے

نماز ہو جائے گی، مگر ظہر کی نماز پیشگی فجر کے ساتھ پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اگر اس درجے کی مجبوری ہے تو عصر کے ساتھ ظہر کی نماز بھی مغرب کے وقت میں پڑھ لیا کرو کہ دونوں نمازیں قضا کی صورت میں ہوں گی، لیکن نماز ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ کوشش کرتے رہو کہ تمھیں دفتری اوقات کے دوران نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے یا کوئی ایسی متبادل ملازمت مل جائے کہ تم یہ نمازیں اپنے اپنے وقت پر ادا کر سکو۔

یہ مغربی دنیا کے ماحول میں ایک ایسے مسلم نوجوان کا مسئلہ تھا جو نماز پابندی سے پڑھنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں درپیش مشکلات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، ورنہ عام طور پر اس طرح کی مشکل دیکھ کر بہت سے لوگ نماز ہی ترک کر دیتے ہیں اور صرف نماز کا مسئلہ نہیں، بلکہ عبادات وفرائض، حلال وحرام اور تعلقات ومعاملات کے بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن میں روزمرہ ضروریات کے ساتھ شرعی احکام کو ملحوظ رکھنا مشکل دکھائی دیتا ہے تو مشکل کا حل تلاش کرنے کی تگ ودو کی بجائے سرے سے شرعی احکام کی پابندی چھوڑ دی جاتی ہے اور یہی رویہ بتدریج دین سے انحراف اور ایک دو نسلوں کے بعد اسلام سے لاتعلقی کا باعث بن جاتا ہے۔ مجھے برطانیہ، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں جاتے ہوئے ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ کم وبیش ہر سال جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ہفتوں وہاں رہتا ہوں۔ مختلف شہروں میں گھومتا پھرتا ہوں۔ دینی اجتماعات اور مسلمان بھائیوں کی تقریبات میں شریک ہوتا ہوں۔ دینی مدارس کے مشاورتی اجتماعات میں بھی شرکت کرتا ہوں اور اس طرح مجھے مسلمانوں کے حالات وواقعات سے براہ راست واقفیت کا موقع ملتا رہتا ہے۔ صحیح دینی راہ نمائی میسر نہ ہونے اور دین سے لاتعلق ہوتے چلے جانے کے نتائج خاص طور پر امریکہ میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

۸۷ء کی بات ہے۔ میں نیویارک میں تھا کہ گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پاکستان سے لوگ سفر کر کے میڈیکل چیک اپ کے لیے آتے ہیں۔ آپ اتفاق سے آئے ہوئے ہیں اور میرا اپنا کلینک ہے، اس لیے اپنا چیک اپ ضرور کرا لیں۔ میں دوسرے دن ان کے کلینک جا پہنچا۔ ایک نوجوان نرس نے، جو سپینش تھی اور عیسائی تھی، چیک اپ کے لیے سرنج کے ذریعے میرے بازو سے خون نکالا۔ جب وہ انجکشن کی سوئی میرے بازو میں داخل کرنے لگی تو میں نے کوئی دعا پڑھی۔ چیک اپ سے فراغت کے بعد میں اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ دوسرے یا تیسرے روز ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ نے خون نکالنے والی لڑکی سے کیا کہا تھا؟ میں پریشان ہو گیا اور کہا کہ بھائی، میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ نہیں، آپ نے کچھ تو کہا تھا۔ میں نے پھر اطمینان دلایا کہ میں اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جب اس نے سوئی چبھوئی تو آپ نے کچھ پڑھا تھا؟ میں نے کہا کہ ہاں، ایک قرآنی دعا پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اسی دعا کی بات کر رہا ہوں۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ جب مولوی صاحب نے یہ دعا پڑھی تو مجھے اپنی دادی یاد آ گئی جو مجھے بچپن میں گود میں لے کر یہی دعا پڑھا کرتی تھی اور مجھے بھی یاد ہو گئی تھی۔ اب مولوی صاحب سے وہی دعا سن کر میرے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گئی ہے۔

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی ایک مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی تھی، مگر دین سے لاتعلقی کی وجہ سے، جس کی ایک بڑی وجہ دینی راہ نمائی کا میسر نہ ہونا بھی ہو سکتی ہے، وہ رفتہ رفتہ اسلام سے لاتعلق ہو گئی اور مسیحیت کی آغوش میں چلی گئی۔

اسی دور کی بات ہے کہ ورجینیا میں ایک جگہ بعض دوستوں نے مجھے پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کہا کہ آپ ان سے بات کریں کہ کچھ نہ کچھ دین سے تعلق قائم رکھیں، ورنہ ان کی اولاد عیسائی ہو جائے گی۔ میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ان سے بات نہیں کی؟ کہنے لگے کہ ہم نے تو کئی بار بات کی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ میرے بیٹے عیسائی ہو جائیں گے تو پھر کیا ہو جائے گا؟ میں نے کہا کہ جب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو مجھ اجنبی کے بات کرنے سے کیا فرق پڑے گا؟ اس کے بعد بھی ان دوستوں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری ملاقات کرانے کی کوشش کی، لیکن وہ دستیاب نہ ہوئے۔

ایک دفعہ شکاگو میں فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ان کے پڑوسی خاندان کا ایک نوعمر لڑکا آیا جو کم وبیش گیارہ بارہ برس کے لگ بھگ ہوگا۔ انھوں نے اسے ''علی'' کہہ کر پکارا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے پڑوس میں رہنے والی فیملی مسلمان ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، یہ عیسائی ہے۔ میں نے پوچھا کہ عیسائی خاندان میں ''علی'' نام کہاں سے آ گیا؟ وہ بتانے لگے کہ ہم نے بھی ان سے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں علی اور عمر کے نام بڑوں میں پائے جاتے تھے۔ اور زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے! امریکہ کے موجودہ صدر باراک حسین اوباما ایک مسلمان باپ کے بیٹے ہیں، باراک حسین کہلانے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے، ان کی دادی نے اخباری خبروں کے مطابق اس سال حج بیت اللہ ادا کیا ہے مگر وہ خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ہیں، جس کا صدر بننے کے لیے نہ صرف مسیحی ہونا بلکہ کیتھولک ہونا بھی دستوری طور پر ضروری ہے۔

یہ مغربی دنیا میں آباد مسلمانوں کو درپیش مسائل کا صرف ایک پہلو ہے کہ دین سے لاتعلقی بسا اوقات ان کی اگلی نسل کے مسلمان نہ رہنے کا باعث بن جاتی ہے اور دین سے لاتعلقی کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ دینی احکام اور سوسائٹی کی روزمرہ ضروریات کے درمیان تطبیق میں کوئی مشکل پیش آتی ہے، تو اس کا بروقت اور مناسب حل نہیں ملتا جس کی وجہ سے صرف چند ایسے افراد ہوتے ہیں جو بہرحال دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرتے رہتے ہیں، لیکن اکثریت ان افراد کی ہوتی ہے جو سوسائٹی کے روزمرہ تقاضوں سے تو دست بردار نہیں ہو سکتے، مگر دینی ماحول اور ضروریات سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں جو دھیرے دھیرے اگلی نسل کے دین سے ہی دست بردار ہو جانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں یہ بات اب سے ربع صدی قبل کے حوالے سے کر رہا ہوں، جبکہ گزشتہ دو عشروں کے دوران اس میں خاصا فرق سامنے آیا ہے اور مغرب میں مقیم مسلمانوں کی نئی نسل کی دین کی طرف رغبت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، لیکن بنیادی مسئلہ اب بھی موجود ہے اور میرے نزدیک مغربی ممالک یا غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے حوالے سے علماء کرام اور دینی حلقوں کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان مسلمانوں کو دین کے ساتھ وابستہ رکھنے اور دینی احکام کے بارے میں ان کو درپیش مسائل واحکام کو حل کرنے کے لیے انھیں دینی راہنمائی مہیا کریں۔

دین کے ساتھ وابستگی قائم رکھنے اور اسلامی عقیدہ وتہذیب کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق کو برقرار رکھنے کے بعد دوسرا بڑا میدان مغربی دنیا میں مسلمانوں کے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دینے کا ہے۔ مغرب نے شادی کو محض ایک سوشل کنٹریکٹ قرار دے کر اور مذہبی تقدس کے دائرے سے نکال کر مرد اور عورت کو برابر قرار دینے کا شوق تو پورا کر لیا ہے، لیکن اس کے تلخ ثمرات اس کے گلے کا ہار بن کر رہ گئے ہیں اور خاندانی نظام کا سبوتاژ ہو جانا مغرب کے دانش وروں کے لیے مستقل دردسر بنا ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب جنسی تعلق کو باہمی رضامندی کی بنیاد پر کسی اور شرط کے بغیر ہر مرد اور عورت کا حق تصور کیا جائے گا، اولاد پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ شادی کرنے اور نکاح کو ضروری نہیں سمجھا جائے گا، شادی اور اس کے بعد کے معاملات وتعلقات پر مذہبی احکام اور تقدس کا کوئی سایہ باقی نہیں رہے گا اور گھر کے نظام کو چلانے کے لیے میاں بیوی کی صورت میں دو برابر اختیارات کے ڈائریکٹر اس کے ذمہ دار ہوں گے تو وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔ پھر کہاں کا نظام اور کہاں کے رشتے؟ چنانچہ نظام اور رشتے دونوں برابر اختیارات کے ان دو ڈائریکٹروں کی کشمکش میں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور اس ماحول میں مسلمانوں کا خاندانی بھی متاثر ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ مغرب میں مقیم مسلمانوں کی اکثریت نکاح وطلاق کو مذہب کے حوالے سے دیکھتی ہے اور شرعی احکام کے دائرے میں

انھیں نمٹانے میں دلچسپی رکھتی ہے، لیکن اس سے فرار اختیار کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے اور خاندان کے حوالے سے مغرب کا قانونی نظام اس فرار کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان لڑکی کا نکاح شرعاً کسی غیر مسلم لڑکے سے جائز نہیں ہے، لیکن مجموعی تناظر میں سیکڑوں مسلمان لڑکیاں مغربی ممالک میں غیر مسلموں کے نکاح میں پائی جاتی ہیں اور بہت سے مغربی ممالک کا قانونی نظام انھیں تحفظ فراہم کیے ہوئے ہے۔

امریکہ میں مسلمانوں کو دستوری طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ نکاح، طلاق، وراثت اور حلال وحرام سے متعلقہ مالیاتی مسائل میں اپنے مقدمات وتنازعات کو اسلامی شریعت کے مطابق طے کرانے کے لیے اپنی عدالتیں بنالیں اور ان شرعی عدالتوں کو باقاعدہ منظور کرا لینے کی صورت میں ان کے فیصلوں کو سپریم کورٹ تک تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ یہ حق دراصل

> دین سے لاتعلقی کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ دینی احکام اور سوسائٹی کی روزمرہ ضروریات کے درمیان تطبیق میں کوئی مشکل پیش آتی ہے، تو اس کا بروقت اور مناسب حل نہیں ملتا

یہودیوں نے اپنے لیے حاصل کیا تھا جس سے مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے نیویارک، شکاگو اور دیگر شہروں میں مسلمان علما کی ایسی عدالتیں دیکھی ہیں جو اس حق کے حصول کی طرف مسلمانوں کی شروعات کا درجہ رکھتی ہیں، جبکہ برطانیہ میں مسلمانوں کو ان کا یہ حق دلوانے کے لیے مسیحیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ کے عالمی سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز نے آواز اٹھائی ہے۔

میرے خیال میں غیر مسلم اکثریت کے ممالک، بالخصوص مغربی ممالک میں مسلم اہل علم اور اہل دانش کی محنت کا دوسرا بڑا دائرہ یہ ہے کہ وہ خاندانی نظام میں مسلمانوں کو ان کے اپنے قوانین پر عمل کا حق دلانے کے لیے محنت کریں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی قوانین کا تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور خالصتاً علمی اور تہذیبی بنیاد پر اس بات کا تعین کریں کہ مغرب کے خاندانی قوانین اور خاندانی نظام کے بارے میں عالمی تصورات کے ساتھ اسلامی احکام کی کہاں تطبیق ہو سکتی ہے اور کہاں نہیں ہو سکتی۔ جہاں نہیں ہو سکتی، وہاں کے بارے میں اپنے موقف اور پوزیشن کا تعین کریں اور اپنے جداگانہ حقوق اور امتیازی قوانین کے حصول کے لیے بھرپور جدوجہد کا اہتمام کریں۔

میرے نزدیک مغربی دنیا اور غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں مسلم اہل علم ودانش کی علمی تگ وتاز کا تیسرا دائرہ دین اور کلچر کے درمیان فرق کو سمجھنے اور اسے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ سمجھانے کا ہے۔ دین ومذہب کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے، جبکہ کلچر علاقائی تعلقات، ضروریات اور باہمی مفادات کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور اس میں علاقائی ماحول، آب وہوا اور موسمی صورت حال کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اسلام خود کو نہ تو کسی علاقائی کلچر کا تابع اور پابند بناتا ہے اور نہ ہی وہ اس کلچر کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اس بارے میں بھی اسلام کا طرز عمل ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کا ہے۔ دین اور کلچر کے فرق کو سمجھنے کے لیے دو تین مثالوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ہمارے ہاں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر خود سے الگ کر دے تو اس کے بعد زندگی بھر کے لیے اس کے ساتھ رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ نہ صرف ان دونوں کے درمیان بلکہ دونوں خاندانوں کے درمیان عام طور پر بائیکاٹ کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ خالصتاً علاقائی کلچر کی بات ہے۔ اس کے برعکس عربوں کے کلچر میں اس قدر سختی نہیں ہے۔ خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایسا ہوا ہے کہ حضرت زینب بنت جحشؓ کو حضرت زید بن حارثہؓ نے طلاق دی تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش کو اپنی طرف سے نکاح کا پیغام دینے کے لیے زید بن حارثہؓ ہی کو بھیجا اور انھوں نے جا کر اپنی سابقہ بیوی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نکاح کا پیغام دیا۔ ہمارے ہاں اس کا سوچا بھی نہیں جا سکتا اور اگر کوئی شخص یہ کہہ کر کہ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اپنی مطلقہ بیوی کے پاس کسی اور شخص کی طرف سے نکاح کا پیغام لے کر جائے گا تو فساد کھڑا ہو جائے گا، سر پھٹول ہو جائے گی اور اگر کسی عدالت یا مفتی کے پاس یہ قضیہ جائے گا تو وہ اسی شخص کو اس فساد کا ذمہ دار قرار دے گا کہ اس نے علاقائی ماحول اور کلچر کا لحاظ کیوں نہیں رکھا۔

یا مثال کے طور پر بنگلہ دیش میں عام لباس تہبند اور دھوتی ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسم عام طور پر گرم ہوتا ہے اور جگہ جگہ پانی میں سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ دھوتی یا تہبند سنت نبوی بھی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام لباس یہی تھا، لیکن اگر آپ کسی شخص کو ترغیب دے کر دھوتی کے ساتھ برطانیہ یا شمالی یورپ کے کسی سرد علاقے میں ہفتہ دس دن کے لیے بھیج دیں تو اس غریب کا کباڑا ہو جائے گا۔

دھوتی ہی کے حوالے سے ایک اور مثال پر بھی نظر ڈال لیں کہ یہ بنگلہ دیش کا عام لباس ہے اور پنجاب کے دیہاتی کلچر میں بھی ''لاچا'' ایک قابل فخر لباس سمجھا جاتا ہے، لیکن پختون علاقوں میں یہ لباس معیوب تصور ہوتا ہے اور دھوتی باندھنے والے کو ''لنگ مار'' کہہ کر طعنہ دیا جاتا ہے۔ اب کوئی صاحب دھوتی باندھ کر پشاور کے کسی گاؤں میں نماز پڑھانے کے لیے مصلے پر جا کھڑے ہوں گے تو ان کے مقتدیوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی۔

سادہ سی بات ہے کہ میں گوجرانوالہ میں رہتا ہوں، یہیں پیدا ہوا ہوں، یہیں پلا بڑھا ہوں اور یہیں کے طرز زندگی کا عادی ہوں، لیکن میں اگر دو چار ماہ کے لیے قاہرہ یا دمشق چلا جاؤں اور وہاں کچھ عرصہ رہنا چاہوں تو مجھے اپنے طرز زندگی، بود و باش اور معمولات میں کچھ نہ کچھ فرق تو لانا ہی ہوگا اور یہ ناگزیر فرق ہے، اسے ہی کلچر کا فرق کہتے ہیں۔ مغربی ممالک میں رہتے ہوئے بھی ہمیں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور دینی احکام اور کلچرل روایات کے درمیان امتیاز کو سمجھتے ہوئے اس بات کا اہتمام کرنا ہوگا کہ خالصتاً دینی معاملات میں تو جن کا تعلق قرآن وسنت کے صریح احکام سے ہے، مجھے اپنے دین ومذہب پر ہی قائم رہنا ہے اور ان سے انحراف کی میرے پاس گنجائش نہیں ہے، لیکن جن معاملات کی بنیاد خالصتاً کلچر اور علاقائی روایات سے ہے اور ان سے کسی دینی حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی، ان میں میرے پاس اس قدر سختی کا کوئی جواز نہیں ہے کہ میں ایک سوسائٹی میں رہتے ہوئے اچھوت ہو کر رہ جاؤں اور بلاوجہ سب سے الگ تھلگ دکھائی دینے لگوں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ میں علاقائی اور قومی کلچر کو چھوڑ دینے کی بات نہیں کر رہا، بلکہ خود مغربی ممالک کے دانش ور مختلف علاقائی کلچروں کے وہاں جمع ہو جانے کو تنوع اور ورائٹی سے تعبیر کر رہے ہیں، اس لیے میری گزارشات کا مقصد کلچر سے دست برداری کا پیغام دینا نہیں، بلکہ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ دینی احکام وقوانین اور کلچرل اقدار وروایات کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو مغربی ممالک اور غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں جا کر زیادہ ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ بسا اوقات ہم اپنی کلچرل اور علاقائی روایات کو بھی مذہب اور شریعت کا درجہ دے کر اس پر اس قدر اڑ جاتے ہیں کہ عجیب مضحکہ خیز سی صورت حال بن جاتی ہے۔

مغرب میں رہنے والے مسلمان اہل علم یا مغرب میں مقیم مسلمانوں کے مسائل ومشکلات سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم ودانش کی ذمہ داری ہے کہ وہ خالصتاً علمی اور تہذیبی بنیادوں پر ان مسائل کا جائزہ لیں، قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی علمی وفکری راہ نمائی کریں۔

غیر مسلم اکثریت کے ممالک بالخصوص مغربی دنیا کے حوالے سے مسلمان ارباب فکر ودانش کی علمی تگ وتاز کا چوتھا دائرہ بین الاقوامی قوانین ہیں، جن سے نہ صرف غیر مسلم اکثریت کے ممالک بلکہ خود مسلم ممالک میں بھی قدم قدم پر مسلمانوں کو واسطہ پیش آتا ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر دستخط اور اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد دنیا بھر کی مسلم حکومتوں کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کریں اور اپنے قانونی نظاموں کو ان

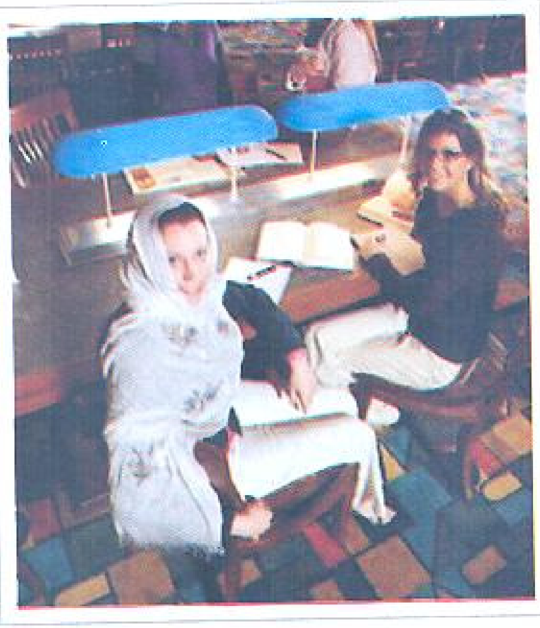

کے دائرے میں رکھیں، جبکہ دینی وعلمی حلقوں کے اس سلسلے میں جو تحفظات ہیں جن کا وہ اظہار بھی کرتے ہیں اور کم وبیش ہر مسلمان ملک میں اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ الجھتے بھی رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس طرز کے دیگر بین الاقوامی معاہدات میں دنیا کے ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کے مذہبی معتقدات اور شرعی احکام وقوانین کا لحاظ نہیں رکھا گیا جس کی وجہ سے ان بین الاقوامی معاہدات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے بین الاقوامی قوانین بہت سے مسائل میں قرآن وسنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں اور ہم مسلمانوں کے لیے قرآن وسنت کے صریح احکام سے دست برداری یا انحراف ممکن ہی نہیں ہے۔ اس طرح یہ ایک مستقل علمی اور فکری کشمکش ہے، جو اس حوالے سے جاری ہے اور اس

سے پیدا ہونے والی ابتری نے ہر علاقے میں اور ہر سطح پر مسلمانوں کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔

اس پس منظر میں آج کے بین الاقوامی قوانین اور اسلامی احکام وقوانین کا تقابلی مطالعہ وقت کی سب سے بڑی علمی ضرورت ہے اور اہل علم کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ نہ تو اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی معاہدات کو یکسر مسترد کرنا ضروری ہے اور نہ ہی من وعن قبول کر لینا درست ہے۔ تقابلی مطالعہ اور تجزیہ وتحقیق کی روشنی میں جن امور کو قرآن وسنت کے اصول کے دائرے میں قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو، ان سے انکار نہیں ہونا چاہیے اور جو امور قابل قبول نہیں ہیں، ان کی نشان دہی ہونی چاہیے۔ ان کے بارے میں علمی بنیادوں پر اپنے موقف کی وضاحت ضروری ہے۔ ان امور پر بین الاقوامی حلقوں سے پوری جرات وحوصلہ کے ساتھ مکالمہ ومباحثہ ہماری ذمہ داری ہے اور صرف مکالمہ ومباحثہ نہیں بلکہ موقف کی وضاحت کے ساتھ اسے منوانے کے لیے بین الاقوامی سطح پر لابنگ اور تشہیری مہم بھی ضروری ہے جو ظاہر ہے کہ علماء کرام اور اہل دانش ہی کا فریضہ قرار پاتا ہے۔

> اسلام خود کو نہ تو کسی علاقائی کلچر کا تابع اور پابند بناتا ہے اور نہ ہی وہ اس کلچر کی مکمل نفی کرتا ہے اس معاملے میں بھی اسلام کا طرز عمل "خذ ماصفا ودع ماکدر" کا ہے

یہ چند دائرے ہیں جن میں علمی محنت وکاوش مغربی ممالک کے حوالے سے ہمارے نزدیک ضروری ہے، بلکہ اب تو مغرب اور مشرق کے عنوان سے الگ الگ بات کرنا تکلف سا محسوس ہوتا ہے، کیونکہ گلوبلائزیشن اور بین الاقوامی تعلقات وروابط نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ کم وبیش ہر جگہ کے اصولی مسائل اور ضروریات کم وبیش یکساں ہیں، اس لیے مغربی ممالک یا غیر مسلم اکثریت کے ممالک کی بجائے اب ان مسائل کے لیے عالمی سطح اور بین الاقوامی ماحول کی اصطلاح زیادہ مناسب لگتی ہے، لیکن ان کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دائروں میں علمی کاوش کی حدود کیا ہونی چاہییں؟ اس علمی کاوش کو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا عنوان دیں یا فقہی ذخیرے پر آج کی عالمی ضروریات کے مطابق نظر ثانی سے تعبیر کریں یا اسے اجتہاد نو کا نام دے دیں، "لامشاحۃ فی الاصطلاح" کے تحت ہمیں ان میں سے کسی پر اشکال نہیں ہے، بشرطیکہ ان اصول وحدود کی پابندی کا لحاظ رکھا جائے جو اس قسم کے مسائل میں علمی طور پر ضروری ہے۔

ہمارے خیال میں جن مسلم ممالک میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت کسی ایک فقہی مذہب پر عمل پیرا ہے، وہاں کے دائرے میں علمی کاوش کو اس فقہی مذہب کے اصول وضوابط کا پابند رہنا چاہیے۔ مثلاً سعودی عرب میں حنبلی، انڈونیشیا میں شافعی، الجزائر میں مالکی، پاکستان میں حنفی فقہ، ایران میں جعفری فقہ اور یمن میں (غالباً) زیدی فقہ کے پیروکاروں کی اکثریت ہے تو ان ممالک کے داخلی مسائل کی حدود میں ان کے اس اکثریتی حق کا احترام کرنا ہوگا کہ ان کے فقہی مسائل ان کے فقہی اصولوں اور قوانین کی روشنی میں حل کیے جائیں۔ جہاں مشترکہ ماحول ہے کہ حنفی بھی رہتے ہیں، شافعی بھی موجود ہیں اور سلفی وغیرہ بھی ان کے ساتھ ہیں تو وہاں دائرے میں تھوڑا سا توسع پیدا کر کے اہل سنت کے مجموعی علمی دائرے کی پابندی کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک معاشرے میں اکٹھے رہنے والے تمام فقہی مکاتب فکر کے نمائندہ اہل علم مل بیٹھ کر مشترکہ سوچ بچار کے ساتھ اپنے مشترکہ اور اجتماعی مسائل کا حل نکالیں اور وہاں کی مسلم کمیونٹی کو ایسی تفریق سے بچانے کی کوشش کریں، جو مجموعی تناظر میں کسی بھی پہلو سے ان کے لیے کمزوری اور نقصان کا باعث بن سکتی ہو۔

یہ فقہی دائرے صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور ان کی بنیاد قرآن وسنت میں موجود ان کے اپنے دلائل پر ہے، جن پر وہ مطمئن ہیں۔ بالخصوص اہل سنت کے دائرے میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری مکاتب فکر ہماری علمی تاریخ کا حصہ ہیں اور ہمارا تقریباً ایک ہزار سالہ علمی ماضی انھی سے عبارت ہے، اس لیے ہمارے نزدیک ان کا احترام اور اپنی اپنی جگہ ان کی پابندی ضروری ہے۔ ان دائروں کو عبور کر کے کسی نئے فقہی مکتب فکر کی تشکیل کی کوئی کوشش نہ آج تک کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہی آئندہ اس کا دور دور تک کوئی امکان موجود ہے۔ اس سے فکری انتشار اور ذہنی کوفت کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور اچھی خاصی علمی صلاحیتیں ایک بے مقصد کشمکش میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ خدا کرے کہ آج کے اہل علم ودانش مختلف حوالوں سے اپنی ملی وعلمی ذمہ داریوں کے پوری طرح ادراک واحساس کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سنجیدہ محنت کا اہتمام کر سکیں۔